میر تقی میر کی شاعرانہ عظمت

ڈاکٹر فضیلت بانو

Dr. Fazeelat Bano

Chairperson, Department of Urdu,
Minhaj University, Lahore.

Abstract:

Mir Muhammad Taqi was an urdu poet of 18th century Mughul India,and one of the Pioneer who gave style to the urdu language itself. He was born in Akbar abad in a family of very modest means. Meer is generally supposed to be a poet of angst but his greatness lies in how he unravelled the existential dilemmas. One of the most remarkable features of his poetry is that he has expressed himself with complete Sincerity and disarming frankness on almost every aspect of life and leaving six divans of urdu and one of persian Ghazals he has left behind, apart of his mas masnavi, musddas, qasida, hajw and wasokht. He also wrote "Nukatushurra", "Zikr e meer" and " Faiz e meer", which ensure him a place of prominence in the annals of urdu literature as a poet, biographer and critic of sorts. He was one of the principal poet of the Delhi school of urdu Ghazal and is often rememberd as one of the best poet of urdu language.

میر کی عظمت کا اظہار ہر دور میں کیا گیا، وہ اپنے زمانے کے منفرد اور صاحب اسلوب شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ میر کی شاعری نے نامور شعرا سے خراج تحسین حاصل کیا۔ بڑے بڑے شعرا میر کی شاعری کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اردو شاعری میں جو مقام و مرتبہ ان کے حصے میں آیا وہ کسی اور کو نہیں ملا۔ شعرائے متاخرین اور اردو کے ناقدین نے میر کو خدائے سخن کہا ہے۔ اٹھارویں صدی میں جو مقبولیت میر کو حاصل ہوئی وہ آج بھی اسی طرح حاصل ہے غالب جیسے بڑے بڑے شاعروں نے میر کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہے۔ میر کے کلام کی رنگینی، تازگی اور بوقلمونی ہمیشہ قائم رہے گی اگرچہ میر کی شاعری کی تخلیقی فکر کو درد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سہل اور آسان اسلوب ان کی شاعری کی امتیازی شان ہے۔ میر نے اپنی شاعری میں فکری عنصر کے ساتھ ساتھ شاندار اور لاجواب صنعتیں بھی استعمال کی ہیں۔ اپنے اشعار کو تکرار لفظی سے بھی خوب نکھارا ہے۔ بچپن سے ہی کلام موزوں ان کی زبان سے ادا ہوتا تھا۔ بچپن اور خاندانی حالات کا ان کی شاعری پر ایک نمایاں اثر ہے۔ میر ۱۷۲۲،۲۳ء میں

آگرہ میں پیدا ہوئے''ذکرِ میر'' ان کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔اس سوانح سے میر تقی میر کی ذاتی زندگی اور گھریلو معاملات کے بارے میں سیر حاصل معلومات ملتی ہیں۔ان کے والد کا نام محمد علی تھا مگر وہ علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔بچپن میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے میر کو بے شمار الائم و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ دشواریوں کا سامنا کرتے گزرا۔ان کی زندگی کا ایک طویل عرصہ دلی اور لکھنو کے پر آشوب دور سے منسلک ہے۔میر عربی النسل تھے ان کے اجداد حجاز سے ہندوستان آئے تھے۔یہاں آکر احمد آباد اور حیدر آباد کے بعد آگرہ میں مستقل سکونت پذیر ہوئے۔میر آگرہ میں ہی پیدا ہوئے۔میر نے ابتدائی تعلیم اپنے منہ بولے چچا سید امان اللہ سے حاصل کی۔امان اللہ میر کے والد کے ایک ہر دلعزیز مرید تھے۔میر کے والد امان اللہ کی صحبت سے بہت مطمئن اور خوش رہتے تھے۔میر تقی چونکہ ایک دین دار اور صوفی منش اور پرہیز گار انسان تھے وہ شب و روز یادِ الٰہی میں محو رہتے اس لیے انھوں نے میر کو صرف سات سال کی عمر میں ہی سید امان اللہ کے سپرد کر دیا تھا جنھیں میر خود عم بزرگوار لکھتے تھے۔امان اللہ اکثر میر کو ساتھ لے کر صوفیوں کے ڈیروں اور خانقاہوں پر چلے جاتے۔میر خانقاہی ماحول کے پروردہ تھے شاید اسی لیے میر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میر کے مزاج میں بد دماغی کی حد تک جو بے نیازی تھی اس میں ان خانقاہوں کی تربیت کا بڑا حصہ تھا۔میر کی ابتدائی زندگی اور تربیت میں بڑی حد تک والد کی تربیت کا بھی حصہ ہے۔کم عمری میں سر سے والد کا سایہ ہی نہ اٹھا بلکہ جلد ہی میر منہ بولے چچا کی شفقت اور محبت سے بھی محروم ہو گئے۔سید امان اللہ کی آغوش محبت بھی میر کو زیادہ دیر میسر نہ رہی۔بے کسی اور بے بسی کا یہ زمانہ میر کے لیے کسی آزمائش سے کم نہ تھا۔ان دونوں ہستیوں کی محبت اور تربیت کا اثر بہر حال میر کی زندگی اور کلام میں نظر آتا ہے۔دونوں ہستیوں کی محبت اور شفقت سے محروم ہو کر اور شدید مصائب اور دکھوں سے نبرد آزما ہونے کے باوجود میر انتہا کے خوددار تھے۔کم عمری میں رزق کی تلاش میں شہر شہر در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔قسمت نے کئی رنگ دکھائے۔زندگی کے نشیب و فراز نے کئی بار لکھنؤ، دہلی اور آگرے کے چکر لگوائے۔بے یار و مددگار میر نے سوتیلے بھائی کو زندگی کا آخری سہارا سمجھا مگر یہ سہارا بھی بہت عارضی ثابت ہوا۔چچا اور والد کے انتقال کے بعد وہ کم سنی میں ہی اپنے سوتیلے بھائی محمد حسن کے ناروا سلوک اور رویے کا شکار ہو گئے۔بھائی نے اس یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے کی بجائے اسے دنیا کی ٹھوکروں کے سپرد کر دیا۔بھائی سے الگ ہو کر میر فکرِ معاش کے لیے دلی چلے گئے، وہاں نواب صمصام الدولہ کے ہاں ملازم ہو گئے۔مگر جب صمصام الدولہ نادر شاہ کے حملے میں مارے گئے تو میر واپس آگرہ آ گئے مگر بے کاری نے پھر ٹکنے نہ دیا اور گزر اوقات کی جب کوئی اور صورت نظر نہ آئی تو پندرہ سال کی عمر میں اپنے ماموں سراج الدین خاں آرزو کے پاس پھر دوبارہ دہلی چلے گئے۔یہاں میر نے عربی اور فارسی پڑھی جس نے ان کی شعر گوئی میں وسعت نظری پیدا کی جس کی بدولت میر کی شاعری میں پختگی اور کمال پیدا ہوا۔''ذکرِ میر'' میں خود میر نے ذکر کیا ہے کہ اس عرصے میں دوستوں سے چند کتابیں لیں، خان آرزو سے کسبِ فیض کے ساتھ ساتھ علوم عقلی و نقلی سیکھے۔یہ چیز میر کے دیوان سے بھی ثابت ہے کہ میر کی شاعری میں جو فارسی محاورے اور تراکیب استعمال ہوئے ہیں وہ سب خان آرزو کی لغت''ہدایت چراغ''ہی سے لیے گئے ہیں میر کا ابتدائی کلام اگرچہ فارسی میں تھا مگر خان آرزو اور سعادت علی امروہی کی صحبت میں انھوں نے اردو ریختہ میں لکھنا شروع کیا۔یہ دور بھی ان کا کچھ زیادہ خوشگوار نہ گزرا۔سوتیلے بھائی کے اکسانے پر خان آرزو جس نے جعفر سعادت علی کے ساتھ مل کر میر کو سہارا دیا تھا بعد میں پریشان کرنا شروع کر دیا۔ان حالات نے میر کو بہت دل برداشتہ کر دیا۔غمِ دوراں اور غمِ حیات نے میر کو ایک جنوں کی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔مشکلات نے بھی گویا ان کا گھر دیکھ رکھا تھا، مضبوط اعصاب کے مالک ہونے کے باوجود میر ذہنی دباؤ کا شکار ہونے سے بچ نہ

سکے۔ان کے خاندان میں ذہنی بیماری کے اثرات پہلے سے موجود تھے۔ان کے ایک چچا بھی ذہنی پسماندگی کا شکار رہ چکے تھے۔ میر بھی ان اثرات سے نہ بچ سکے اور جنوں کا شکار ہو گئے۔ حالات کی دگرگونی نے رشتہ داروں سے تو دور کیا ہی تھا، دوست احباب کا حلقہ بھی ختم کر دیا۔ میر خاندانی حالات اور روایات کی پاسداری کرنے والے تھے، عربی النسل روایات اور اعلیٰ خصوصیات ان کی شخصیت میں موجود تھیں۔ زندگی کے نشیب وفراز کے باوجود خاندانی اور وراثتی اثرات نے انھیں حالات کا شکار نہ ہونے دیا۔ ''ذکرِ میر'' میں بیان کرتے ہیں کہ ان کے دادا نے فوج میں شمولیت اختیار کی تھی لیکن وہ جلد ہی ہندوستان کے شہر گوالیار میں انتقال کر گئے۔

میر ایک حساس اور دردمند دل رکھتے تھے۔اس دردمندی نے ان کی شاعری کو اپنے دور کا ایک دردمند نوحہ بنا دیا۔ میر کا زمانہ فتنہ وفساد اور شورشوں کا زمانہ تھا۔ سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی وملکی ہر لحاظ سے یہ افراتفری اور انتشار کا دور تھا۔ مشکلات ومصائب سے تھک ہار کر میر کئی بار گوشۂ عافیت کی تلاش میں نکلے۔ دہلی میں سکون نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ میر بھی ان حالات میں وہاں بہت دل برداشتہ تھے۔ یہ وہی دور تھا جب میر کی غزل گوئی کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی۔ مغلیہ سلطنت روز بروز زوال کا شکار ہو رہی تھی۔ ابدالیوں نے بار بار حملے کر کے دہلی کو ویران کر دیا تھا۔ مرہٹوں اور روہیلوں نے بھی ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا چکی تھی۔ ثقافت اور تہذیب وتمدن نام کی کوئی چیز باقی نہ بچی تھی، رہی سہی کسر ۱۸۵۷ء کے غدر نے پوری کر دی۔ حالات کے ستم نے مغل حکمرانوں کو انگریزوں کا ماتحت بنا دیا۔ یہ سب حالات میر کے چشم وذہن پر بھی رقم ہو رہے تھے۔ان کا حساس دل حالات کا اثر پوری طرح قبول کر رہا تھا۔ جب حالات نے زیادہ سنگینی اختیار کی، نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں کی وجہ سے دہلی کا سکون درہم برہم ہو گیا تو میر نے بھی لکھنؤ کی راہ لی۔

دِلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا(۱)

ان حالات میں اہل دہلی کی ایک بڑی تعداد نے دہلی کو خیر باد کہہ کے لکھنؤ کا رخ کیا۔ میر بھی حالات کی اسی رو میں بہ رہے تھے۔ میر کی شاعری کا طوطی ہر سُو بول رہا تھا۔ شاعری کے اسی چرچے کی وجہ سے نواب وزیر الملک آصف الدولہ بہادر نے میر کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی تو میر نے اس دعوت کو قدرت کا ایک انعام سمجھ کر قبول کر لیا۔ سفر کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کر کے بالآخر لکھنؤ میں سکونت پذیر ہوئے۔ دہلی کی پُر خار زندگی نے یہاں آ کر کسی قدر سکھ کا سانس لیا اور جلد ہی اہل لکھنؤ کو اپنی شاعری کا گرویدہ بنا لیا۔ یہاں کی آسودگی میں نواب آصف الدولہ کی طرف سے ملنے والے ماہانہ وظیفہ کو بھی بڑا دخل تھا جو انھوں نے ان کی زبان دانی میں مہارت کے عوض انھیں عطا کرنا شروع کیا تھا لیکن میر زبان دانی میں مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ تُند مزاج بھی تھے اور اپنی تند مزاجی کی بنا پر اس وظیفے سے جلد ہی ہاتھ دھو بیٹھے اور آصف الدولہ کے دربار سے الگ ہو گئے۔ یہ میر کی زندگی کی گردش کے ماہ وسال تھے جن میں دہلی کی یاد کی کسک ہمیشہ انھیں تڑپاتی رہی۔ وہ زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھ چکے تھے لیکن خزاں رسیدہ دِلّی کو دل سے نہ نکال سکے۔ لکھنؤ میں ذہنی طور پر خوش نہ تھے۔ ہمیشہ بے سکون ہی رہے لیکن دہلی کی نسبت یہاں آسودہ حال رہے تو پھر لکھنؤ کو ہی اپنا مستقل ٹھکانہ بنائے رکھا، آخری سانس تک لکھنؤ میں رہے اور پھر کبھی دہلی کی طرف مڑ کے نہ دیکھا۔ دہلی اور لکھنؤ شاعروں کا مسکن تھا۔اس دور کے شعرا اپنے نام کے ساتھ دہلی اور لکھنؤ لکھنا باعثِ اعزاز سمجھتے تھے۔ دہلی کی

بربادی کے بعد اردو زبان کو بھی لکھنؤ میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

دہلی اور لکھنؤ اردو زبان کے مستند مرکز سمجھے جاتے تھے، شاعروں اور ادیبوں نے بھی زبان کو خوب چمکایا۔ میر کی تخلیقات میں ''ذکرِ میر'' اور ''فیضِ میر'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان میں حالاتِ زندگی کے علاوہ میر کے مذہبی عقائد و نظریات، ان کی دینی و دنیاوی فکر، مختلف دلچسپیاں اور سرگرمیوں کے علاوہ دیگر معلومات بیان کی گئی ہیں۔ یہ تصانیف میر کے بارے میں معلومات کا ایک مستند ذریعہ سمجھی جاتی ہیں۔ تذکرہ نگاری کے حوالے سے میر کی کتاب ''نکات الشعرا'' کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ تذکرہ ۱۷۵۱ء میں لکھا گیا۔ اس میں تقریباً ۷۲ معروف اور غیر معروف شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس تذکرہ نگاری کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ صرف شاعروں کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے مختلف کلام کو بھی درج کیا گیا ہے بلکہ ان شعرا کے بارے میں میر کی اپنی ذاتی رائے بھی درج ہے۔ اس تذکرے کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں نا صرف میر کے ہم عصر شعرا کے بارے میں ہمیں بہت سی معلومات ملتی ہیں بلکہ میر نے اس دور کے اپنے حالات واقعات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ میر نے کسمپرسی کے جس دور میں انتہائی کرب و مصیبت کا مقابلہ کیا اور زندگی کے سفر کو جاری رکھا، اس کی روداد اور اظہارِ واقعات نے میر کے بارے میں بھی کئی پردے اٹھائے ہیں۔ میر اپنے حالات و واقعات جس انداز سے بیان کرتے ہیں وہ متاثر کن انداز کسی بھی حساس ذہن کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے۔ میر کا دور انسانی الائم کے ساتھ ساتھ بے قدری اور بے آبروئی کا دور تھا۔ ہر شعبۂ حیات میں انسانیت بے توقیر ہو رہی تھی۔ بے حسی اور بے قدری نے انسانی آبرو کے ساتھ ساتھ انسانی جان کو بھی ارزاں کر دیا تھا۔ میر بھی ان حالات میں صرف تماشائی نہ رہ سکے۔ حالات و واقعات نے ان کے ذہن پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ بکھرتے اور اجڑتے در و دیوار ماحول کا نوحہ لکھ رہے تھے۔ میر کے دل و دماغ کی طرح ان کی شاعری بھی ان اثرات سے نہ بچ سکی۔

سیاسی، سماجی، ملکی اور معاشرتی ہر طرح کے حالات کا عکس میر کی غزل میں نظر آتا ہے۔

تلوار کے تلے ہی گیا عہدِ انبساط
مر کے ہم نے کاٹی ہیں اپنی جوانیاں

کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا یکبارگی

میر کے ہاں ہمیں حساسیت کے انفرادی اور اجتماعی دونوں رنگ ملتے ہیں۔ ان کی تشبیہات اور استعارات دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ دل پذیر بھی ہیں۔ ان کے پر درد لہجے میں ترنم، آہنگ اور موسیقیت کا اثر انسانی جذبات کی تطہیر کرتا نظر آتا ہے۔ میر کی شاعری میں جا بجا ہمیں خود کلامی کا عنصر بھی نمایاں ملتا ہے۔ گویا میر قاری سے نہیں خود سے ہمکلام ہیں، ان کی ہم کلامی کا انداز قاری کو تڑپا کے رکھ دیتا ہے۔ ان کے اشعار کی تڑپ، دلسوزی اور اثر انگیزی کا کمال ہی ہے کہ آج بھی ان کی شاعری ماضی کی طرح مقبول اور دلفریب ہے۔ خوبصورت تشبیہوں اور استعارات کے استعمال نے ان کے کلام کو ایک دائمی اثر بخشا ہے۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے آج بھی زندہ و جاوید ہیں۔ یہ میر کا انتہائی کمال ہے کہ ان کی شاعری میں مردہ حالات و واقعات کی زندہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان کے بیان کی حدت اور گرم جوشی نے زندگی کے مشاہدات و تجربات کو فنی خلوص کے ساتھ شاعری کا اعلیٰ و

ارفع نمونہ بنادیا۔خیالات کی پختگی اورفکری حساسیت نے دردوغم کی تصویروں کوزندگی کے رنگ بھر کے پیش کیا۔میر کی شاعری میں کہیں بھی تصنع اور بناوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔اجڑے ہوئے شہر،لٹی ہوئی بستیاں، بجھے ہوئے دل میر کی شاعری کا عنوان بن گئے جنہیں ماہ وسال کا گردوغبار بھی نہ مٹاسکا یہ اشعار دیکھیں:

روشن ہے اس طرح دل ویراں میں داغ ایک
اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہ
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

میر کی شاعری میں تشبیہات واستعارات اورفن مصوری کی باکمال مثالیں ہیں۔اشعار کی ترکیب بندی اوراستعارات کے استعمال میں میر نے فارسی اوراردودونوں کے ملاپ سے خوبصورت تشبیہات پیدا کر کے اردوغزل کوایک جدید اسلوب سے آشنا کیا ہے۔تشبیہات واستعارات میر کی شاعری کا خاص وصف ہیں اورانھیں جس انداز سے برتا گیا ہے اور جس طرح سے زبان زدعام ہیں اس چیز نے میر کی شاعری کوخواص اورعوام میں دونوں حلقوں میں مقبول بنا دیا ہے۔میر کے اشعار کیفیات اور احساسات کی خوبصورت منظرکشی کرتے ہیں۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
ہستی اپنی حباب کی سی ہے یہ نمائش سراب کی سی ہے(۲)

میر نے اردوادب میں غزل کو وہ مقام بخشا کہ یہ صنف سب اصناف سخن پر حاوی ہوگئی۔غزل کو بام عروج تک پہنچانے کی وجہ سے غزل کی تاریخ میں میرایک بلندوبالا مقام پرنظرآتے ہیں۔میر کے عطاکردہ غزل کے اسلوب کے اثرات آج بھی مروج ہیں۔انھوں نے غزل میں جس فن کو پروان چڑھایااس نے غزل کو زندہ و جاوید صنف بنا دیا،میر کا اسلوبِ غزل شاعری کی جان سمجھا جاتا ہے۔

میر کی غزل میں سادگی اورسچائی ہی نہیں شورانگیزی بھی ہے سادگی کے ساتھ ساتھ سوز وگداز اوردردوکسک نے ان کی غزل کی اثرآفرینی کواور بڑھا دیا ہے ڈاکٹر یوسف حسین لکھتے ہیں:

''میر جو کچھ کہتے ہیں نرم وملائم لفظوں میں کہتے ہیں ان کی غزلوں کا ترنم ان کی روح کی موسیقیت کا آئینہ دار ہے۔ان کی غزل کا ہرلفظ سوز وگداز میں رچا ہوا ہونے کی بدولت دل کے پار ہوتا ہے ان کا کلام سن کرسامع نہایت لطف اندوز ہوتا ہے۔''(۳)

میر کی شاعری میں ایک نمایاں عنصرترنم اورموسیقیت کا ہے اوریہی میر کی غزل کی عظمت کا باعث ہے۔میر کی غزل انسانی دکھ درداورمصائب کی آئینہ دار ہے جن سے میر کوتصوراتی یاتخیلاتی نہیں بلکہ ذاتی طور پرواسطہ رہا ہے وہ ان کو بہت سادگی سے بیان کرتے ہیں۔ان کی شاعری کی عظمت کا ایک سبب ان کی سادہ بیانی ہی ہے۔ان کا فنی کمال یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات اور نظریات کے اظہار کے لیے ایسی بحریں استعمال کرتے ہیں جن میں آہنگ اورترنم کے ساتھ ساتھ موسیقیت بھی پائی جاتی ہے۔ بحرمختصر ہو یا طویل میر نے دونوں کوکامیابی سے استعمال کیا ہے۔انھوں نے نہ صرف فارسی کی مروج بحروں کوخوبی سے استعمال کیا

ہے بلکہ ان کو اردو غزل کے مزاج کا حصہ بنا کر بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔انھوں نے غزل کو سوز و گداز کے ساتھ ساتھ کیف و سرور سے بھی ہمکنار کیا۔

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

میر کی شاعری کا محور حسن وعشق ہے۔میر کے ہاں ہمیں یہ محور اردو کے دوسرے غزل گو شاعروں کی نسبت نمایاں نظر آتا ہے میر کی شاعری نے غزل کو عظمت بخشی اور غزل ہمیشہ سے عشق سے وابستہ رہی ہے۔میر کا عشق مجاز اور حقیقت دونوں کا مجموعہ ہے اور یہ بات بھی طے ہے کہ میر نے کسی تصوراتی نہیں بلکہ گوشت پوست کے متحرک و زندہ محبوب سے عشق کیا۔میر کے تصورِ عشق نے ان کے زندہ محبوب کو حسن و جمال کا ایک جیتا جاگتا احساس جمال عطا کیا، اپنی بھرپور قوت تخیل سے اپنے متحرک محبوب کا ایک ایسا پیکر تراشا کہ قاری کا تصور شعور و ادراک، پاکیزگی اور حسن و لطافت کی شفافیت کا حامل نظر آتا ہے۔ان کا محبوب رنگ و نور کا پیکر بھی ہے اور مادی کثافتوں سے منزہ بھی۔

ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
ان کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

میر کا عشق محبوب کی عزت و توقیر کے ساتھ ساتھ آداب عشق بھی سکھاتا ہے کیوں کہ میر نے خود عشق ہی سے زندگی کا حوصلہ اور سلیقہ سیکھا،عشق سے ہی زندگی میں چہل پہل اور حرکت و عمل پیدا کیا۔میر اپنی زندگی میں جن حالات و واقعات سے دوچار رہے اس کے برعکس اگر ان کی زندگی آسودگی اور راحت و آرام سے ہمکنار ہوتی تو ان کا عشق زندگی کی حرارت کا باعث نہ ہوتا، زندگی کی گہما گہمی اور گونا گونی کا باعث نہ ہوتا۔اگر میر خود حالات کی چکی میں نہ پسے ہوتے، ان پر غموں کے پہاڑ نہ ٹوٹے ہوتے، اپنوں اور غیروں کی سرد مہری نے ان کے دل و دماغ کو چھلنی نہ کیا ہوتا، کبھی وطن اور کبھی غریب الوطنی کی خاک نہ چھانی ہوتی، غربت وافلاس نے ان کو اپنوں اور غیروں کے غم کا اسیر نہ کیا ہوتا، ان کے جذبات بے قدری کی بھٹی میں تپ کر کندن نہ بنے ہوتے تو شاید میر عشق کی اس لذت سے بھی آشنا نہ ہوتے، اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ عشق نہ ہوتا تو کارخانہ قدرت خاموش اور بے حرکت و بے حس ہوتا، بے لذت اور بے کار رہتا۔میر نے اپنے محبوب سے عشق نہیں عشق کی انتہا کر دی۔میر نے اپنے محبوب کو حسن و جمال کا ایک شاہکار بنا کے پیش کیا ہے۔میر کی مایوس اور بے زار زندگی میں عشق نے رنگا رنگی اور چہل پہل پیدا کی۔میر کے خیال میں کارخانۂ قدرت صرف عشق کی حدت سے گرم ہے ورنہ دنیا میں ہر طرف خاموشی اور موت کا سناٹا ہوتا۔میر کا عشق روحانی اثرات کا حامل ہے ان کی غزلیہ شاعری میں متصوفانہ کیفیت بہت نمایاں ہے۔

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں
اک آگ میرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں
لایا ہے میرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیٔ راز نہاں ہوں

میر کی بکھری اور نامکمل شخصیت کی تعمیر عشق کی بدولت مکمل ہوئی۔ میر کی شاعری میں آفاقیت بھی ہے اور مقامیت بھی، میر نے جو کچھ حاصل کیا عشق سے کیا، میر کے جنوں کو ان کے عشق نے لافانی بنا دیا، وہ ہمیشہ غم و یاس اور فکر و افسردگی سے دوچار رہے ان کی اس کیفیت نے ان کے غمِ جاناں میں اور زیادہ سوز و گداز پیدا کر دیا۔

لوگ بہت پوچھا کرتے ہیں کہئے میاں کیا ہے عشق
کچھ کہتے ہیں سرِ الٰہی، کچھ کہتے ہیں خدا ہے عشق

عشق کی روایت کو معنویت دیتے ہوئے میر کہتے ہیں:

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں پھر رہا ہے عشق
عشق معشوق ہے عشق عاشق ہے
یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

میر کے نزدیک عشق ہی فائل اور عشق ہی مفعول ہے۔ میر کے ہاں ظاہری اور معنوی عشق کی دونوں کیفیتیں ملتی ہیں۔ سچے جذبے اور جستجو ہمیشہ کامرانی سے ہمکنار کرتے ہیں۔ انسان کے اندر جستجو اور تلاش نہ ہو تو وہ ایک مٹی کی ڈھیری کی مانند ہے۔ زندگی اور عشق لازم و ملزوم ہیں۔ عشق بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاتا ہے، راہبری کرتا ہے اور کامیابی کا ضامن بنتا ہے۔ میر کی ساری شاعری میں خونِ جگر جھلکتا نظر آتا ہے۔

''میر کی شاعری میں کنارہ کشی کی مختلف شکلیں پائی جاتی ہیں ان کی ساری غزلوں میں میر کا خونِ جگر جھلکتا نظر آتا ہے، میر نے زندگی ناکامیوں میں بسر کی اس لئے ان کے بہت سے اشعار ناکامیوں کے مرجھائے ہوئے غنچے معلوم ہوتے ہیں جن کو موجِ بہار اور بادِ صبا کھلانے سے قاصر رہی۔''(۴)

میر خود شناس اور خود فہم شاعر تھے، وہ خود کو عظیم کہتے ہیں جس کو ناقدین نے شاعرانہ تعلّٰی سے معمول کیا ہے۔ وہ شاعری میں بھی اعلیٰ انسانی اقدار اور انسانی عظمت کے قائل ہیں۔ وہ اپنے احساسات اور جذبات کو دردانگیزی کے ساتھ بیان کرتے ہیں ہیں۔ ان کی غزل اردو اور فارسی دونوں خصوصیات سے متصف ہے۔ وہ اردو اور فارسی غزل کے بڑے استاد ہیں۔ ہر دور میں شاعروں نے ان سے فیض اٹھایا۔ شاعری میں غزل ان کا خاص مزاج بنی۔ انہوں نے فارسی کے بعد اردو غزل کو بھی پوری مہارت اور خوش اسلوبی سے نبھایا، غمِ عشق، الائم زندگی، مضامین کی خوبصورتی، تشبیہات و استعارات کا استعمال، تجربے کی گہرائی، احساس کی شدت سب خصوصیات نے مل کر میر کی عظمت کو چار چاند لگا دیے۔ میر کی عظمت کا اعتراف ہر دور میں کیا جاتا رہے گا۔

''ان کی فارسی شاعری ہلکی پھلکی اور رواں ہے، اس میں نرمی گھلاوٹ اور شرینی ملتی ہے اور

عشق کے آفریدہ درد و غم کی تصویر کشی کے لیے بے حد موزوں ہے۔''(۵)

میر کی غزل میں تصوف کا رنگ ان کے گھریلو ماحول کی بدولت تھا، یہ رنگ کہیں کمال اور کہیں با کمال نظر آتا ہے۔ان کے بزرگ صوفیانہ مزاج کے حامل تھے، یہ میر کا وراثتی رنگ ہے۔ میر نے اپنے آس پاس جذب و مستی میں ڈوبے ہوئی شب و روز دیکھے تھے، وہ اس رنگ سے اپنا دامن بچا نہیں سکتے تھے۔ان کی شاعری تصوف کا گہرا رنگ لیے ہوئے ہے،ان کے تصوف کا رنگ نا قابل تقلید ہے کیونکہ یہ خالص جذبوں سے سینچا ہوا ہے۔ان کی محرومیوں، نا کامیوں اور کسک میں تصوف کی گھلاوٹ ہے ان کا عشق محض دنیاوی عشق نہیں بلکہ یہ ایک وسیع جذبہ ہے۔میر صوفیا کی اس فکر سے تعلق رکھتے ہیں جو ساری کائنات کہ عشق سے مربوط کرتی ہے:

''یوں تو میر کو تمام اصناف سخن پر استادانہ قدرت و مہارت حاصل ہے لیکن ان کا خاص میدان غزل ہے اور غزل میں وہ مضامین تغزل کے دائرے سے باہر نکلنا گوارا نہیں کرتے۔ان کی فارسی غزلوں میں بھی تغزل کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں جن میں محبوب کے حسن ناز و انداز اور اس کی ہر ادا کو نہایت دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے تغزل کے عناصر میں تکلف و تصنع کا عکس نہیں پڑتا اس لیے دور از کار تشبیہات و استعارات کے استعمال سے میر نے اپنے تغزل کا چہرہ مہرہ نہیں بگاڑا، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں علم بدیع، صنائع بدائع خال خال ہی نظر آتے ہیں۔حدیث دل بیان کرنے کے لیے جس صاف ستھرے، پیچیدگی سے پاک انداز بیان کی ضرورت ہے میر نے اس کو اپنا اسلوب بنایا۔میر سراپا عشق و سراپا سوز تھے اس کی ترجمانی فطری طور پر اس انداز سے نہیں ہو سکتی جو الفاظ و معنی کے غیر ضروری تکلفات کے بوجھ سے دبا ہوا ہو۔''(۶)

میر متقی نے کہا کہ بیٹے عشق اختیار کر کہ دنیا کے اس کارخانے میں اس کا تصرف ہے۔اگر عشق نہ ہو تو نظم کل کی صورت نہیں پیدا ہو سکتی،عشق کے بغیر زندگی وبال ہے، دل باختہ عشق ہونا کمال کی علامت ہے،سوز و ساز دونوں عشق سے ہیں، عالم میں جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے۔باپ کی نصیحت کا اثر تھا یا ماموں کی بے اعتنائیوں کا میر نے عشق کے آفاقی جذبوں سے زندگی کی ہما ہمی کو اپنے اندر اتارا۔عشق میر کی شاعری کی روح ہے زندگی کے مصائب و الائم اور مشکلات عشق کی راہ کی رکاوٹ نہیں بنتے بلکہ عشق کو نکھارتے ہیں، عاشق کو ثابت قدم بناتے ہیں۔عشق کی تڑپ اور کسک زندگی کی نا کامی نہیں بلکہ کامیابی کی دلیل ہے، میر کے نزدیک عشق کائنات کی وسعت کا نام ہے، عظمت کا نام ہے، روح میں اترنے والے اس جذبے کا نام ہے جو آفاقی صفات کا حامل ہوتا ہے، عشق مجازی ہو یا حقیقی دونوں میں عظمت انسان پوشیدہ ہے۔عشق ایک عالمگیر جذبہ ہے اس کی صداقت اور طاقت سے انکار ممکن نہیں:

''میر حسن پرست تھے، عشق میں چوٹ کھائے ہوئے تھے وہ اپنے اس جذبے کو اس صداقت سے بیان کرتے ہیں کہ دل پر نشتر کا کام کر جاتے ہیں۔''(۷)

میر کی دردمندی ہی ان کا فلسفۂ غم ہے، میر کی زندگی کے غم و الائم نے انھیں مایوسیت کا شکار کر دیا تھا۔زندگی کی تلخ حقیقتوں کا اعتراف اور پھر ان تلخیوں کو مٹانے کی کوشش میں خود کو شاعری میں ڈبونے کا تلخ و شیریں تجربہ کیا جس نے میر جیسے قنوطی

کورجائیت عطا کی۔ میر کے غم میں غم ذات اورغم دوراں دونوں کا احساس ملتا ہے بقول جمیل جالبی:

''اپنے غم کے اظہار سے اپنے قاری کوپستی کے عالم سے اٹھا کر بلندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ میر ہمیں رلاتے نہیں ہیں بلکہ غم کواس طرح بیان کرتے ہیں کہ ہم غم کے حسن اورحسن بیان سے خودکواس طرح بھول جاتے ہیں جیسے کسی بدنما چیز کی خوبصورت تصویر دیکھ کر ہم اس کی بدنمائی کوبھول جاتے ہیں۔''(۸)

میر عشق کوزندگی اورموت دونوں سے مربوط کرتے ہیں یعنی عشق کی ابتدا زندگی ہےاوراس کی انتہا موت ہے زندگی کی تلخیوں کے ساتھ ساتھ عشق کی بے رحمی ہی موت کا دوسرا نام ہے۔ میر کی شاعری میں رنج وغم کے جذبات کہیں حوصلہ اورکہیں بجھے ہوئے دل کی تصویر ہے وہ خود کہتے ہیں:

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم جتنے کیا جمع تو دیوان کیا(۹)

میر کی فارسی اوراردوغزلیں دونوں اہمیت کی حامل ہیں۔ دونوں کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ ان کی شاعری ان کے ذاتی تجربات کا نچوڑ ہے جوسچائی اورصداقت کے جذبوں سے لبریز ہے۔ میر کی شاعری کے تنوع اور ہمہ گیریت نے اسے ایک لازوال مرتبہ عطا کیا ہے۔ میر نے زندگی کے ہر پہلو کی شاعری کے ذریعے مصوری کی ہے۔ ان کی مصورانہ شاعری نے انھیں سرتاج شعرا بنادیا۔ فارسی اوراردوغزل گوئی میں میر بے تاج بادشاہ کے مرتبے پر فائز ہیں۔ غزل گوئی میں کوئی میر کی عظمت کونہیں چھوسکتا۔ میر کی شاعری آج ضرب الامثال کی حیثیت رکھتی ہے۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

حوالہ جات

۱۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، لکھنؤ: مطبوعہ منشی نول کشور، ۱۹۴۱ء، ص:۳۴
۲۔ میر تقی میر، دیوان اول، لکھنؤ: مطبوعہ منشی نول کشور، ص:۵۳
۳۔ یوسف حسین خاں، اردوغزل، اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۷۴ء، ص:۲۳۴
۴۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، رسالہ نیادور، اترپردیش لکھنؤ، اپریل ۱۹۸۵ء، ص:۱۸
۵۔ اختر علی سلہری، رسالہ نقوش، لاہور: ادارہ فروغ اردو، نومبر ۱۹۸۰ء، ص:۵۳۳
۶۔ وحید اختر، ڈاکٹر، خواجہ میر درد تصوف اور شاعر، علی گڑھ: لیتھوکلر پرنٹس، ۱۹۸۱ء، ص:۳۳۷
۷۔ عارف حسین جونپوری، نیادور، میر تقی میر نمبر، اترپردیش لکھنؤ، مئی ۲۰۱۰ء، ص:۷۹
۸۔ مقدمہ، انتخاب کلامِ میر، دائرۃ الافادہ، حیدرآباد، ص:۹
۹۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، دیوان سوم، مقدمہ عبدالباری آسی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

☆......☆......☆